(غلام گردش)

وسائل کی بالٹی

قوموں پر کڑے وقت آتے رہتے ہیں۔مصائب کی بھٹی سے نکل کر ملک فولاد ہو کر باہر نکلتے ہیں۔ ہر قوم کیلئے امتحان انفرادی سطح پر بھی پیدا ہوتے ہیں اور اجتماعی سطح پر بھی۔تاریخ کا غیر جانبدار مطالعہ یہ سبق سکھاتا ہے کہ وقت کی مناسبت سے اچھی حکمتِ عملی، نافذ کرنے کیلئے سرکاری یا غیر سرکاری مشینری اور عام لوگوں کا اعتماد وہ عناصر ہیں، جنکی بدولت مشکل وقت کٹ جاتے ہیں۔قومیں اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑی ہو جاتی ہیں اور زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے۔ملک میں موجودہ خراب معاشی صورتحال ہرگز ہرگز نئی نہیں ہے۔اسکے پیچھے مالی بے ضابطگیوں کی ایک المناک بلکہ شرمناک تاریخ موجود ہے۔مگر اس وقت ہر مسئلہ کو ماضی میں ڈھونڈنے کی بجائے، ٹھنڈے دماغ سے نئی معاشی حکمتِ عملی ترتیب دینے کی اَشد ضرورت ہے۔کڑوا ترین سچ یہ ہے کہ منصوبہ بندی اور اس پر عمل درامد کافی حد تک حکومت کا کام ہے۔اسی بنیاد پر لوگ کسی بھی شخص کو ووٹ کی طاقت سے وزیر اعظم، صدر، وزیر، وزراء اعلیٰ بناتے ہیں کہ وہ دوررس فیصلے کرے۔یہ فیصلے ساری قوم کی اجتماعی امانت ہیں جسکا احساس کرنا ہی کسی بھی لیڈر کا اصل ایمان ہوتا ہے۔اس میں کسی مذہبی رجہان کا عمل دخل نہیں۔صاحبِ اختیار لوگوں کو عام آدمی کی بہتری کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا چاہیے۔موجودہ صورتحال سے گھبرانے بلکہ شرمانے کی بجائے اس پوری انسانی بساط سے مقابلہ کرنا اصل امتحان ہے۔صاحب اقتدار لوگوں کا بھی اور شائد عوام کا بھی۔ویسے عوام تو کڑے امتحان دے دیکر نڈھال ہو چکے ہیں۔پھر بھی اُمید لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔یہی انسانی فطرت ہے۔یہی زندگی ہے۔

پاکستان بلکہ کسی بھی خطے کی معیشت کو درست کرنا مشکل کام ضرور ہے مگر ناممکن قطعی نہیں ہے۔اس میں اقتصادی ماہر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔صاحب فہم ہونا اور زمینی حقائق کا علم ہونا بڑی حد تک مسئلے کے حل کی تدبیر کی طرف لیجا سکتا ہے۔جزئیات کو ماہرین پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ڈنگ زیاؤ پنگ کی مثال سامنے رکھیے۔چین کی اقتصادی ترقی میں جس لیڈر نے پورے ملک کی صنعتوں کو دنیا کیلئے کھولا، وہ ڈنگ زیاؤ پنگ تھا۔اسکے بغیر آج کا چین وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔اسکی تعلیم اور تربیت پر نظر ڈالیے۔ہرگز ہرگز اقتصادی ماہر نہیں تھا۔سیاست میں گندھا ہوا انسان جو قوم کی معیشت کو سمجھتا تھا۔اسکی اقتصادی منصوبہ بندی نے چینی قوم کی قسمت بدل ڈالی۔سنگاپور کی اقتصادی ترقی کی پوری دنیا میں مثال دی جاتی ہے۔جس لیڈر نے اسکی کایا پلٹ دی، وہ ایک وکیل تھا۔لی کان یو، کیمرج سے قانون کی ڈگری لیکر واپس آیا تھا۔اقتصادیات سے دور دور تک کا کوئی تعلق نہیں تھا۔سنگاپور کی اقتصادی ترقی میں اسکا ماہر اقتصادیات نہ ہونا بے معنی ہے۔ملیشیاء کی ترقی مہاتیر کے سر ہے۔وہ میڈیکل ڈاکٹر ہے اور اقتصادیات سے اسکا کوئی تعلق نہیں تھا۔ان تین ممالک کی حیرت انگیز ترقی اسکے ان سیاسی رہنماؤں کی بدولت عمل میں آئی، جو کسی بھی سطح کے معاشی ماہر نہیں تھے۔یہ نکتہ انتہائی اہم ہے۔ہمارے ہاں، ایک تاثر موجود ہے کہ ملک کی اقتصادی صورتحال صرف معاشی ماہرین ٹھیک کر سکتے ہیں۔جو مثالیں دی ہیں، وہ اس بنیادی نکتے کے خلاف ہیں۔ابھی تک کوئی شواہد موجود نہیں ہیں کہ ملکی معیشت کو بڑھانے، چلانے کیلئے صرف اقتصادی جادوگر ہی ہونے چاہیے۔اس تاثر کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے۔ہاں، باریکیوں میں جانے کیلئے ماہرین کی خدمات مستعار لینے میں کوئی حرج نہیں۔پاکستان کی شرح

نمو پر غور کیجئے۔فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں بے مثال ترقی ہوئی تھی۔مگر وہ کسی بھی صورت میں معاشی ماہر نہیں تھا۔ایک معاملہ شناسی لیڈر، ملک کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ضرورت صرف اور صرف سوجھ بوجھ کی ہے۔ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم معیشت کو ٹھیک کرنے کا کام ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں، جنکی تعلیم و تربیت اقتصادیات میں ہوئی ہو۔دوسرے زاویے سے بھی پرکھیے۔جن تاجران نے گزشتہ پانچ سے چھ دہائیوں میں کارخانے لگائے، مشینوں کا جال بچھایا، کیا ان میں کوئی اقتصادی ماہر تھا۔ہرگز نہیں۔آج تک کوئی بھی معاشی ماہر، اچھا کاروباری انسان نہیں بن سکا۔ہمیں اس مخصوص بیانیے سے باہر نکلنا چاہیے کہ ہماری معاشی تقدیر کو صرف مخصوص ماہرین میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ آگے کیسے چلا جائے۔سادہ سا مسئلہ ہے کہ ہمارے اخراجات، ہماری محصولات سے زیادہ ہیں۔بیشتر حکومتیں صرف اور صرف ٹیکس کلچر کو ڈنڈے سے بڑھانے کی دلدل میں غائب ہو جاتی ہیں۔الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر مباحثوں پر غور کیجئے۔ہر تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ ٹیکس کوئی نہیں دے رہا۔یہ صرف آدھا سچ ہے۔ویسے اس پر بھی بحث ہونی چاہیے کہ ہماری تیس پینتیس سال کے حکمران، لوگوں سے جمع کیے ہوئے ٹیکس کو کس بے دردی بلکہ شاہانہ طریقے سے خرچتے رہے۔درست ہے کہ ٹیکس کلچر کو فروغ ملنا چاہیے۔مگر کیا ہم دوسرا مشکل کام کرنے کیلئے تیار ہیں۔حکومتی اور ذاتی سطح پر اخراجات کو حد درجہ کم کرنا چاہتے ہیں۔عملی اقدامات کا ذکر کر رہا ہوں۔زبانی جمع خرچ تو بہت ہوئی اور ہوتی رہیگی۔مگر کیا کوئی بھی حکومت، ادارہ، امیر آدمی اخراجات کو نصف حد تک کم کرنے کیلئے تیار ہے۔ہرگز نہیں۔بالکل نہیں۔ہم اپنا شاہانہ طرزِ زندگی بدلنے کو کفر سمجھتے ہیں۔حکومتی سطح سے شروع کرتے ہیں۔کیا کوئی مقتدر شخص چھوٹی گاڑی میں سفر کرنا چاہے گا۔مرسیڈیز اور قیمتی گاڑیوں کو ترک کریگا۔کوئی اعلان کریگا کہ سرکاری ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر استعمال نہیں کریگا۔پانچ ایکڑ کے سرکاری گھر کو ترک کر کے پانچ مرلے کے گھر میں شفٹ ہوگا۔رہن سہن کی سادگی کی طرف آیئے۔کیا کوئی وزیراعلیٰ، وزیراعظم، صدر یا کوئی بھی بڑا حکومتی شخص، اعلان کریگا کہ آج سے سرکاری خزانے سے مہمان داری نہیں کریگا۔اپنے کچن کو خود چلائیگا۔اپنا کام خود کریگا۔ہوسکتا ہے، آپ پوچھیں، کہ یہ کس ملک میں ہوتا ہے۔اسکی موجودہ مثال ناروے، سویڈن، ڈنمارک، آئس لینڈ اور کئی مغربی ممالک کی قیادت کے رہن سہن میں ہے۔ہالینڈ کا ایک وزیراعظم اور اسکا پرنسپل سیکرٹری گھر سے دفتر اور واپسی کیلئے سائیکل کا استعمال کرتا تھا۔ہالینڈ کا یہ وزیراعظم ہمارے جیسے ملک کے رہنماؤں کیلئے سبق تو ضرور ہے، مگر اس طرح کے سبق یہاں کوئی پسند نہیں کرتا۔عرض کرنے کا مقصد یہ کہ اگر نیلسن مینڈیلا، دو سے تین مرلے کے گھر میں زندگی کا بیشتر حصہ گزار سکتا ہے تو ہمارے مقتدر طبقے کو نوابی طریقوں سے زندگی گزارنے کو فی الفور ترک کر دینا چاہیے۔اگر کوئی بھی وزیراعظم سادگی کی مثال بن جائے، تو یقین مانیئے۔قوم فیصل کی طرح اسکے فیصلوں کے اردگرد کھڑی ہو جائیگی۔سوچیے۔کیا واقعی ہماری جیسی فقیر قوم کو اتنے عالیشان، قصرِ صدارت، گورنر ہاؤس، وزیراعلیٰ ہاؤس، جی او آر کی ضرورت ہے۔جواب آپ خود دیجئے۔

حکومتی رویے کے بعد اب امراء کے اخراجات کا تجزیہ کیجئے۔ہمارا امیر طبقہ کسی صورت میں سادگی پسند نہیں کرتا۔ہر ایک کو سفر کیلئے بی ایم ڈبلیو، آووڈی، مرسیڈیز یا لینڈ کروزر چاہیے۔لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ یا کسی بھی بڑے شہر کے سُپر سٹور پر چلے

جایئے۔قیمتی ترین استعمال کی اشیاء قطار اندر قطار بکتی ہوئی نظر آئینگیں۔غیر ملکی پنیر کے وہ وہ برینڈ نظر آئینگے جو واشنگٹن تک میں موجود نہیں ہیں۔غیر ملکی، مہنگا ترین دودھ، خوردنی تیل، شیمو، پرفیوم آپکو ہر جگہ نظر آئینگے۔کتوں، بلیوں اور مچھلیوں کی غیر ملکی خوراک بھی عام پڑی ہوئی ملے گی۔کیا یہ تمام مہنگی ترین غیر ملکی اشیاء واقعی ہماری ضرورت ہیں۔جواب نفی میں ہے۔نہ حکومت انکی امپورٹ بند کرنے میں سنجیدہ ہے اور نہ امراء اپنی طرزِ زندگی بدلنے کے خواہاں ہیں۔کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ بڑے اور چھوٹے شہروں میں اب امیر لوگوں کے گھروں میں غیر ملکی نوکر اور نوکرانیاں موجود ہیں۔لاہور میں آپکو امیر علاقوں میں غیر ملکی نوکر عام نظر آئینگے۔بچوں کیلئے فلپائنی نوکرانیاں ہر طرف گھومتی نظر آئینگی۔کیا واقعی یہ سب کچھ جائز ہے۔جب تک ملک میں معاشی بحران ہے،اس طرح کے اللے تللوں کو سختی سے بند کرنا چاہیے۔امراء کو چھوڑ کر عوامی سطح پر زندگی کو دیکھیے۔لاہور، اسلام آباد، کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں بڑے بڑے ہوٹل اور ریستوران موجود ہیں۔کسی جگہ چلے جایئے۔ریسٹورنٹ بھرے نظر آتے ہیں۔اگر آپ پہلے نشست مختص نہ کراوائیں تو بیس منٹ سے لیکر چالیس منٹ تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔کسی بڑے ہوٹل میں کمرہ بُک کروانا چاہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اگلے دس بارہ دن، کوئی بھی کمرہ خالی نہیں ہے۔لاہور کھانے پینے کا گڑھ ہے۔کسی بھی ریسٹورنٹ میں کھانا، پندرہ سو سے لیکر اٹھائیس سو سے قطعاً کم نہیں ہے۔معاف کیجئے۔یہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں۔اسکا کیا مطلب ہے۔ایک تو یہ کہ ہمارے عام طبقے کو بھی اپنا طرزِ زندگی بدلنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ہر طرف گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا سیلاب ہے۔پٹرول کے مہنگے ہونے سے کیا لوگوں نے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا استعمال بند کر دیا ہے یا کم کر دیا ہے۔کم از کم مجھے تو ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔کیا آپ نے عوامی سطح پر کبھی یہ سنا۔کہ آج سے ہم سائیکل استعمال کرینگے یا پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کو فوقیت دینگے۔اسطرح کی عملی تبدیلی بھی کم از کم طالبعلم کو نظر نہیں آئی۔

اخبارات اور ٹی وی پر دیکھیے تو لگتا ہے کہ ملک دیوالیہ ہو گیا۔عزتِ نفس کو گروی رکھ کر بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے بھیک مانگتے نظر آئینگے۔تمام عمائدین بھی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے سامنے مجبور نظر آتے ہیں۔مگر کیا یہ بالکل عجیب بات نہیں کہ ہم حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر کسی طریقے سے بھی سدھرنے کو تیار نہیں۔اخراجات کو کم کرنا تو دور کی بات۔کسی سطح پر بھی ان اخراجات کو معقولیت کی حدود میں لانے کیلئے بھی رضامند نہیں۔ان چیزوں کی امپورٹ پر پابندی لگانے کو بھی گوارا نہیں کرتے، جنکے بغیر بڑے آرام سے گزارا ہو سکتا ہے۔دراصل ہم قوانین قدرت کی نفی کر رہے ہیں۔اپنے عظیم دین کی انقلابی تعلیمات کو عملی طور پر اپنانے کیلئے تیار نہیں۔کوئی طبقہ بھی اپنے شاہانہ طرزِ زندگی کو تبدیل کرنا نہیں چاہتا۔اسطرح کی صورتحال میں اگر ہم مزید کئی بلین ڈالر قرض لے لیں۔تب بھی معیشت اور مسائل جوں کے توں رہینگے۔ہمارے وسائل کی بالٹی میں اتنے سوراخ ہیں کہ پوری دنیا بھی ہماری امداد کو آ جائے، پھر بھی ہمارے وسائل لایعنی معاملات پر خرچ ہوتے رہینگے۔اصل مشکل ترین فیصلے ان چھیدوں کو بند کرنا ہے۔اسکے لیے ہمیں اقتصادی ماہر نہیں، بلکہ معمولی سوجھ بوجھ والے لوگ چاہییں۔مگر یہ بازار میں نہیں ملتے۔انہیں کیونکر ڈھونڈا جائے اور فیصلہ سازی پر مجبور کیا جائے۔اسکا کوئی فارمولا دنیا میں موجود نہیں۔ہمارے حالات ایسے کے ایسے ہی رہینگے!

راؤ منظر حیات